بسم اللہ الرحمن الرحیم

ششماہی علوم القرآن علی گڑھ، ۳۱/۱-۲، جنوری - دسمبر ۲۰۱۶ء

اداریہ

مسابقت الی الخیرات کی دعوت- قرآن وحدیث کی روشنی میں

ظفر الاسلام اصلاحی

قرآن وحدیث سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو نیک کاموں کا عادی بنائیں اور جس حد تک ممکن ہو نیکیوں کا خزانہ جمع کرتے رہیں تا کہ یہ آخرت میں ہمارے کام آئے جہاں کسی اور پونجی کی قدر و قیمت نہ ہوگی۔ یہ حقیقت کہ اعمالِ صالحہ پر ہی اخروی زندگی کی کامیابی اور خوشگواری کا دارومدار ہے، قرآن کریم میں جگہ جگہ ذہن نشیں کرائی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

بَشِّرِ الَّذِيْن آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّلِحٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ (البقرۃ:۲/۲۵)

خوش خبری سنا دیجیے کہ جو ایمان لائے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی۔

وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحاً يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِن تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيهَا أَبَداً ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التغابن:۶۴/۹)

اور جو ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا اللہ اس کی گناہوں کو مٹا دے گا اور اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، یہ لوگ ہمیشہ ہمیش اس میں رہیں گے۔ یہی [اصلاً] بڑی کامیابی ہے۔

اس طرح کی متعدد آیات کریمہ سے یہ قیمتی نکتہ اخذ ہوتا ہے کہ انسان کی کامیابی کا دارومدار دو ہی چیزوں پر ہے: ایمان وعملِ صالح۔ ایمان کی حیثیت جڑ کی ہے اور دراصل

وہی عمل معتبر، مقبول اور مستحقِ اجر وثواب ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو یا جو ایمان کی جڑ پر قایم ہو۔ دوسری جانب عمل صالح سے ایمان کو رفعت و بلندی عطا ہوتی ہے اور اسی سے برگ و بار لاکر پھل دار یا نتیجہ خیز بنتا ہے۔ درج ذیل آیات اسی حقیقت کو واضح کر رہی ہیں:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعاً إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (الفاطر ۳۵:۱۰)

پس جو کوئی عزت چاہتا ہے [تو وہ جان لے کہ] ہر طرح کی عزت اللہ ہی کے لیے ہے۔ اسی کی طرف پاکیزہ کلمہ صعود کرتا ہے اور عمل صالح اس کلمہ کو بلند کرتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (ابراهيم ۱۴:۲۵)

کلمۂ طیبہ کی مثال ایسے درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں اور وہ ہر آن اپنے پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ [ان سے] نصیحت حاصل کریں۔

بلاشبہ اعمالِ حسنہ یا نیکیاں ایمان کے مظاہر ہیں، عبادات کی بجا آوری، اخلاق کی آراستگی، کردار کی بلندی اور نیکی کی طلب، سب کچھ ایمان ہی کے ثمرات میں سے ہیں۔ درحقیقت یہ اہلِ ایمان کا خاصہ ہے کہ وہ خالی رہنے کے بجائے نیک کاموں میں مشغول رہنا پسند کرتے ہیں اور لغو کاموں سے احتراز کرتے ہیں، اس لیے کہ ان پر آخرت کی فکر غالب رہتی ہے قرآن مجید بار بار انہیں یہ سبق یاد دلاتا ہے کہ وہ نہ صرف اکتسابِ خیر میں مصروف رہیں، بلکہ اس باب میں مسابقت کا رویہ اختیار کریں یعنی اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ انسانی زندگی مسلسل تگ و دو اور جد و جہد سے عبارت ہے، حرکت اس کا خاصہ ہے۔ ہر انسان نے، جیسا کہ عام مشاہدہ ہے، دوڑ و بھاگ کا ایک میدان منتخب کر رکھا ہے، ہر ایک تگ و دو کے لیے ایک خاص دائرہ اختیار کرتا

ہے اور اسی میں وہ اپنی جسمانی و ذہنی توانائیاں اور دیگر وسائل صرف کرتا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہر ایک کے سامنے ایک ٹارگٹ ہے جسے پانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار نظر آتا ہے خواہ وقت ہو، مال و دولت ہو یا سکون و آرام ہو۔ اسے اپنے پسندیدہ میدان میں جد و جہد کرتے ہوئے اتنا لطف محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس راہ میں ہر تکلیف و زحمت کو ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے۔ تعلیم، زراعت، تجارت، صنعت، حرفت، ملازمت، مال و دولت، منصب و عہدہ، حکومت و اقتدار کا حصول انسانی جد و جہد کے وہ معروف میدان ہیں جو نوعیت کے کچھ اختلاف کے ساتھ ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیوی زندگی کی بہتری و ترقی کے لئے جد و جہد قرآن کی نظر میں معیوب نہیں بلکہ وہ اس کی ترغیب دیتا ہے، لیکن قرآن کریم کی رو سے اہلِ ایمان کے لئے کوشش اور دوڑ و بھاگ کا اصل میدان نیکی کمانا یا بھلائی کے کام کرنا ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُواْ الْخَيْرٰتِ (البقرۃ: ۲/۱۴۸)

ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے۔ وہ اسی کی طرف رخ کرنے والا ہے، تو تم نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو۔

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَـٰكِن لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُم فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ إِلَى الله مَرْجِعُكُمْ جَمِيعاً فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (المائدۃ: ۵/۴۸)

اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا، لیکن [وہ چاہتا ہے کہ] تم کو آزمائے اس چیز میں جو اس نے تمہیں عطا کی ہے پس تم لوگ نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو، اللہ ہی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے اور وہ تمہیں باخبر کرے گا۔

اس آیت میں نہ صرف دنیوی زندگی میں انسان کو ارادہ و عمل کی آزادی دینے کی غرض و غایت بتا دی گئی، بلکہ اسے یہ بھی ذہن نشیں کرا دیا گیا کہ اس آزمائش میں اس کی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ نیکی کی راہ میں مسابقت کو اپنا ٹارگٹ بنائے۔ مزید براں اسے خیر کی طلب میں آگے بڑھنے کی دعوت نہایت واضح انداز میں اس آیت میں دی گئی ہے:

سَارِعُوْا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران:۱۳۳/۳)

اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کے لئے آگے بڑھو جس کی وسعت آسمانوں و زمین کی طرح ہے۔ یہ پرہیز گاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اللہ سے مغفرت طلب کرنا گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہے اور یہ بجائے خود ایک نیکی ہے۔ دوسرے قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یعنی یہ بھی خطاؤں کی معافی کا وسیلہ بنتی ہیں (ھود:۱۱۴/۱۱)۔ اس طرح اس آیت سے بہرصورت اعمالِ صالحہ کی راہ میں جدوجہد کی ترغیب ملتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ پر اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور ہر مومن کا اس پر پختہ ایمان ہے کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات ایک نہایت آرام دہ و پرسکون، رنج و غم اور فکر و خوف سے پاک اور انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھرپور جنت کی خصوصیات بیان کر کے انسان کو نہ صرف اس کے حصول کے لیے سعی و جہد کی ترغیب دی گئی ہے بلکہ ان کے دل و دماغ میں یہ حقیقت بھی جاگزیں کرنی مقصود ہے کہ اگر انہیں دوسروں سے آگے بڑھ جانے کی کوشش یا مقابلہ آرائی کرنی ہے تو وہ اسی میدان (حصولِ جنت) کو منتخب کریں۔ سورہ المطففین میں جنت کی خصوصیات اور اس کی لازوال نعمتوں کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (المطففین:۲۶/۸۳)

پس جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز (جنت) کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔

بلاشبہ اس آیت میں حصول جنت کی راہ میں دوڑ بھاگ کی ترغیب وتشویق کے ساتھ ان لوگوں کے لیے تنبیہ بھی ہے جو اس فانی زندگی کی حقیر و ختم ہو جانے والی لذتوں کے حصول کے لیے دن رات تگ و دو کرتے رہتے ہیں اور جو چیز اصلاً چاہنے اور دوڑ بھاگ کر کے حاصل کرنے کی ہے، اس کی کوئی فکر و طلب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ منکرین یا

خدا فراموش اور خود فراموش کی روش ہے، جب کہ قرآن کے بیان کے مطابق اہلِ ایمان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نیکی کی راہ میں مسلسل دوڑ بھاگ کو اپنا مشن بناتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

أُولَـٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ (المومنون:۲۳/۶۱)

یہی لوگ نیکیوں کی طرف دوڑنے والے اور اسے پالینے والے ہیں۔

حقیقت یہ کہ نیکی کمانے کی راہ میں وہی لوگ تیزی سے رواں دواں رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں جنھیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ نیکیاں ہی اخروی زندگی میں کام آنے والی ہیں اور انہی کے خزانہ پر ہمیشہ ہمیش کی زندگی کی کامیابی اور خوش گواری منحصر ہے۔ قرآن کریم اس پہلو سے بھی مسابقت الی الخیرات کی دعوت دیتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں دوڑ بھاک کرنے والے تو بہت ہوتے ہیں، لیکن اللہ کو ان لوگوں کی دوڑ بھاگ پسند ہے جنہوں نے ایمان کی دولت سے سرفراز ہوکر آخرت کو اپنا ٹارگٹ بنایا ہے اور نیکیاں کمانا اپنا مشن قرار دیا ہے۔ یعنی نیکیوں کی راہ میں جی جان کھپانا ہی اللہ کے یہاں قابلِ قدر اور موجبِ اجر وثواب ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

مَنْ أَرَادَ الآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَـٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا (بنی اسرائیل:۱۷/۱۹)

جو کوئی آخرت کا خواستگار ہوا اور اس کے لیے شایانِ شان کوشش بھی کی اور وہ مومن ہے تو یہی لوگ ہیں جن کی کوشش قبولیت پائے گی۔

قرآن کریم نے اس پہلو سے بھی نیکی کی راہ میں سرگرداں رہنے پر ابھارا ہے کہ دنیا کمانے کے لیے کوئی رات دن دوڑ بھاگ کرتا رہا تو اس میں سے اسے اتنا ہی ملے گا جو اس کے لیے مقدر ہے اور جو کچھ ملے گا وہ آخرت کے مقابلہ میں بہت کم ہوگا اور جلد ہی ختم ہو جائے گا یعنی اس کی رات دن کی مصروفیات کا جو حاصل ہوگا وہ متاعِ قلیل ہوگا اور اس سے وہ بہت مختصر مدت تک ہی فائدہ اٹھا پائے گا، لیکن اس تھوڑی پونجی کے لیے ہمہ وقت تگ و دو کی وجہ سے اگر فرائض سے غفلت ہوئی اور آخرت کا نقصان ہوا تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا جس کے نتائج تکلیف دہ ہوں گے۔ مذکورہ بالا آیت سے پہلے قرآن نے یہی

حقیقت گوش گذار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوماً مَّدْحُوراً (بنی اسرائیل:۱۸/۱۷)

اور جس کو دنیا ہی کی طلب ہو، اس کو ہم جس قدر چاہتے ہیں اور جس کے لیے چاہتے ہیں دے دیتے ہیں اور پھر [آگے] اس کے لیے جہنم طے کر رکھی ہے جس میں وہ داخل ہوگا، خوار اور راندۂ بارگاہ ہوکر۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہوئی کہ دنیا کی بے ثباتی و بے حقیقتی ثابت کرنے اور اس کے مقابلہ میں بہر حال آخرت کو ترجیح دینے کی ترغیب دیتے ہوئے قرآن نے دو چیزوں کی طرف خاص طور سے انسان کو متوجہ کیا ہے: اول یہ کہ دنیا اور اس کی چیزیں آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑی ہیں۔ دوسرے ان سے انسان ایک محدود مدت تک کے لیے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس لیے کہ وہ چیزیں ایک نہ ایک دن ختم ہو جانے والی ہیں۔ یہ حقیقت دیگر متعدد آیات (البقرۃ:۳۶/۲، آل عمران:۱۸۵/۳، ۱۹۷، النساء: ۷۷/۴، الاعراف:۲۴/۷، التوبۃ:۳۸/۹؛ الرعد:۲۶/۱۳؛ النحل:۱۱۷/۱۶؛ الانبیاء:۱۱۱/۲۱، النور:۳۸/۲۴، الحدید:۲۰/۵۷) میں بھی واضح کی گئی ہے۔ جو لوگ آخرت کی بھلائی کی راہ میں تکلیفیں برداشت کرنے سے گریز کرتے ہیں اور جان و مال کی قربانی دینے سے دور بھاگتے ہیں اور صرف دنیا کے آرام کو پسند کرتے ہیں انہیں مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَرَضِيتُم بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ (التوبۃ:۳۸/۹)

کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو پسند کرلیا ہے۔ [اگر ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ] دنیوی زندگی کا یہ سب سر و سامان آخرت کے مقابلہ میں نہایت قلیل ہے۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے:

وَفَرِحُواْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الآخِرَةِ إِلاَّ مَتَاعٌ (الرعد:۱۳/۲۶)

اور یہ دنیا کی زندگی پر مگن ہیں اور [حقیقت یہ کہ] دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں محض ایک [حقیر] پونجی ہے۔

آخرت کی زندگی کو ترجیح دینے اور اسی کی بہتری کو دنیوی زندگی میں ساری جدو جہد کا مقصود اصلی بنانے کی ترغیب دیتے ہوئے قرآن کریم نے اس نکتہ پر بھی زور دیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ رعنائی و رنگینی اور دلفریب چیزیں ہیں وہ سب انسان کی آزمائش کے لیے ہیں کہ ان کے تئیں وہ کیا رویہ اپناتا ہے، ان میں ڈوب کر خالق و مالک کو بھول جاتا ہے یا یاد رکھتا ہے، انہی سے لذت اندوزی کو اپنا مقصدِ زندگی بناتا ہے یا کچھ آخرت کی فکر بھی رکھتا ہے اور نیک عمل کی جانب راغب ہوتا ہے۔ کیا انسان کو نہیں معلوم کہ یہ ساری زینتیں جو اسے لبھاتی ہیں ناپائیدار اور محض چند روزہ ہیں، کیا ان سے لو لگانا اور ان سے فوائد کے حصول کے لیے انہی کے پیچھے پڑے رہنا عقلمندی ہے یا حیاتِ جاوداں کو سنوارنے کے لیے جدو جہد کرنا باعثِ خیر اور نفع بخش ہے۔ یہ آیت اسی پہلو سے غور وفکر کی دعوت دے رہی ہے:

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً وَإِنَّا لَجٰعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْداً جُرُزاً (الكهف:۱۸/۸)

جو کچھ روئے زمین پر ہے اسے ہم نے زمین کے لیے زینت بنایا ہے تاکہ لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں عمل کے لحاظ سے کون اچھا ہے۔ اور اس پر سب جو کچھ ہے اسے بالآخر ایک دن چٹیل میدان بنا کر رہیں گے۔

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی تشریح کے مطابق اس آیت میں اصلاً انتباہ ہے ان لوگوں کے لیے جو دنیا کی دلفریبیوں میں مدہوش ہو کر اپنے خالق کا حق پہچاننے کو تیار نہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دلفریبیوں کا سارا سامان جو زمین میں پھیلا ہوا ہے وہ ان کی آزمائش کے لیے ہے کہ ان میں ڈوب کر اپنے خالق کو بھول جاتے ہیں یا یاد رکھ کر کچھ اس کی رضا جوئی کے کام بھی کرتے ہیں۔ اور اگر نہیں کرتے تو وہ جان لیں کہ یہ سدا کے لیے

نہیں، وہ وقت ایک دن آجائے گا جب اس ساری زیب و زینت کی بساط کو لپیٹ کر ایک اجاڑ و سپاٹ میدان بنا دیا جائے گا (محفلِ قرآن، الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنو، ۲۰۱۶ء، ۲۸۲/۵)۔

قرآن کی وہ آیت بڑی باعثِ عبرت ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو آخرت کی فکر سے عاری ہو کر دنیا کی طلب میں دن رات ایک کیے رہتے ہیں اور اگر کچھ اچھے کام کرتے بھی ہیں تو محض دنیوی غرض یا فائدہ کے لیے، وہ بڑے گھاٹے بلکہ سب سے بڑے گھاٹے میں ہیں، اس لیے کہ ان کی دوڑ بھاگ آخرت میں کچھ فائدہ دینے والی نہیں، ان کی جدو جہد اخروی زندگی کے اعتبار سے بے سود ہوگی اور ان کے اعمال انجام کے لحاظ سے اکارت ثابت ہوں گے۔ قرآن کی یہ آیت اسی پہلو سے انسان کو متنبہ کر رہی ہے اور اسے آخرت کی تعمیر کے لیے کچھ کر گزرنے پر ابھار رہی ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالًا الَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا

(الکہف: ۱۸/۱۰۳۔۱۰۵)

کیا ہم تمھیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں؟ وہ جن کی ساری تگ و دو اسی دنیا کی زندگی کے پیچھے اکارت گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں، [یہ وہ لوگ ہیں] جنھوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، پس ان کے سارے اعمال اکارت گئے اور قیامت کے دن ہم ان کو ذرا بھی وزن نہ دیں گے۔

حقیقت یہ کہ قرآن یہ راز بھی منکشف کرتا ہے کہ روزِ جزا پر یقین اور خالق و مالک کے حضور حاضری و جواب دہی کا احساس ہی انسان کو آخرت کی بھلائی کے لیے سرگرداں رہنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس میدان میں اسے رواں دواں رکھتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

مَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ اللّٰهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللّٰهِ لَآتٍ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (العنکبوت:۲۹/۵)	جو کوئی اللہ سے ملاقات کی توقع رکھتا ہے[وہ جان لے کہ] اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے ہی والا ہے، اور وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اس آیت کے حوالے سے مولانا محمد یوسف اصلاحی تحریر فرماتے ہیں:

''یعنی جو لوگ عقیدۂ آخرت کے قائل ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن خدا کے حضور حاضر ہو کر ذرّہ ذرّہ کا حساب دینا ہے، انہیں سمجھنا چاہیے کہ موت آنے ہی والی ہے اور معلوم نہیں کس گھڑی مہلتِ عمل ختم ہو جائے اور وہ ہر وقت اپنی عاقبت کو بنانے کی فکر رکھتے ہیں اور کسی وقت بھی وہاں کی فکر سے غافل نہیں ہوتے'' (قرآنی تعلیمات، مکتبۂ ذکریٰ، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۳)۔

واقعہ یہ کہ اللہ ربّ العزت کے حضور پیشی اور باز پرس کا احساس ہی مشکل سے مشکل عبادت کی بجا آوری پر ہمہ آن مستعد رکھتا ہے اور نیک عمل کی انجام دہی کی راہ کی تمام مشکلات کو آسان بنا دیتا ہے۔ بلا شبہ تمام فرض عبادات میں نماز جس قدر اہم و افضل ہے اسی قدر جملہ اصول و آداب کی رعایت کے ساتھ پنج وقتہ اس کی پابندی بڑی مشکل بھی ہے، لیکن قرآن کے بیان کے مطابق قیامت میں اللہ کے حضور حاضری پر ایمان و یقین ہے جو نماز کے اہتمام کو آسان کر دیتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِينَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (البقرۃ:۲/۴۵-۴۶)	اور صبر و نماز کے ذریعہ مدد چاہو اور بے شک یہ بھاری ہے مگر ان لوگوں کے لیے نہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ [ایک روز] اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

انسان روزمرہ زندگی میں مسلسل حرکت میں ہے اور ہر شخص نے (جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے) اپنی دلچسپی کے مطابق اپنی بھاگ دوڑ کا ایک میدان منتخب کر رکھا ہے

اور اس میں وہ دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہتا ہے، لیکن کس نے دوڑ بھاگ کے لیے صحیح میدان منتخب کیا ہے اور اس میں کس کی کوشش صحیح رخ پر ہے اس باب میں بھی رہنمائی قرآن کریم سے ملتی ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

قَدْ جَاءَ كُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُّبِينٌ. يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (المائدہ: ۵/۱۵-۱۶)

تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ گئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہا ہے اور صراط مستقیم کی طرف ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔

اسی کے ساتھ قرآن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ روز مرہ زندگی میں مقابلہ آرائی یا دوسروں سے آگے بڑھ جانے کا وصف اختیار کرنے والوں میں جو صحیح رخ پر ہیں ان کے رخ کو صحیح کرنے میں کون سے عوامل کارفرما ہیں؟ ارشادِ الٰہی ہے:

الَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ وَالَّذِينَ هُم بِآيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ وَالَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَى رَبِّهِمْ رٰجِعُونَ أُولٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ

(المومنون: ۲۳/۵۸-۶۱)

اور وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ترساں رہتے ہیں اور جو اپنے رب کی نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں اور جو اپنے رب کا شریک کسی کو نہیں بناتے اور جو کچھ وہ دیتے دلاتے ہیں تو اس طرح دیتے ہیں کہ ان کے دل خوف سے بھرے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے، یہی وہ ہیں جو بھلائیوں کی راہ میں سرگرم ہیں اور اور ان کے لیے سبقت کرنے والے ہیں۔

ان آیات سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر پختہ ایمان، خشیتِ الٰہی اور روزِ جزا اللہ رب العزت کے حضور حاضری کا احساس ہی انسان کو مسابقت بالخیرات کا خوگر بناتا ہے اور نیکی کی راہ میں دوسروں سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ان آیات کو ماقبل آیات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے اور سمجھا جائے تو ایک اور اہم پیغام سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ دنیوی مال و اسباب کا میسر آجانا کوئی بھلائی اور خیر کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ یہ سب مال و متاع چند روزہ اور فانی ہیں جو وقت مقررہ پر انسان کا ساتھ چھوڑ دینے والے ہیں۔ اصل فائدہ کی چیز تو وہ ہے جو ساتھ نہ چھوڑے اور آخرت میں کام آئے اور بلا شبہ ایمان اور عمل صالح کی بدولت ہی یہ نعمت نصیب ہوتی ہے۔ اسی سورہ (المومنون) میں مذکورہ بالا آیات سے قبل انسان کو اس جانب متوجہ کیا گیا ہے کہ کسی کو بہت زیادہ مال و دولت یا دوسرے ساز و سامان کا میسر ہو جانے پر یہ خوش گمانی نہ ہو کہ اسے بھلائیاں نصیب ہو رہی ہیں یا یہ کہ جس سمت میں وہ بھاگ دوڑ کر رہا ہے وہ درست ہے اور اس کے ساتھ خیر کا معاملہ ہو رہا ہے۔ دراصل اس کی بھلائی اللہ کے احکام کے مطابق مال کمانے و خرچ کرنے اور اس کے ذریعہ نیکی کا خزانہ جمع کرنے کے لیے خوب دوڑ بھاگ کرنے میں ہے، نہ کہ غلط و صحیح کی تمییز کے بغیر اس راہ میں سرگرداں رہنے میں۔ قرآن کریم سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انسان جلد فائدہ کے حصول کی خاطر ان راہوں پر تیزی سے بھاگتا ہے جو اس کے لیے بالآخر مضر و مہلک ثابت ہوتی ہیں، جب کہ خیر کی طرف دوڑنا اس کی فطرت میں داخل ہے اور اسی کے طرف اسے تیزی سے بھاگنا چاہیے۔ یہ آیت اسی کی طرف رہنمائی کر رہی ہے:

وَيَدْعُ الإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الإِنسَانُ عَجُولاً (بنی اسرائیل: ۱۷/۱۱)	اور انسان برائی کا طالب اس طرح بنتا ہے جس طرح اس کو بھلائی کا طالب بننا چاہیے اور انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔

اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں اس طور پر بیان کیا گیا ہے:

إِنَّ هَـٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَ هُمْ يَوْماً ثَقِيلاً (الدہر:۷۶/۲۷)

حقیقت میں یہ لوگ حاضر [دنیا کی زیب و زینت] پر ریجھے ہوئے ہیں اور اسی کے بالمقابل بھاری دن [آخرت] کو پسِ پشت ڈالے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ کہ اس غلط رویہ کی اصلاح یا روز مرہ زندگی میں مذکورہ انحراف کو ختم کرنے کے لیے قرآن ہی سے رہنمائی ملتی ہے، جیسا کہ قرآن نے اپنے اس وصفِ خاص کو متعدد مقام پر واضح کردیا ہے کہ یہ کتاب ہر معاملہ میں وہ راہ دکھاتی ہے جو بالکل سیدھی ہے(انّ هذا القرآن یهدی للّتی هی اقوم/ بنی اسرائیل:۱۷/۹)۔یہاں یہ واضح رہے کہ قرآن نے انسان کو بار بار اس کی اس روش پر متنبہ کیا ہے کہ وہ جلد مل جانے والی چیز یعنی دنیا کی طلب میں اتنا سرگرداں رہتا ہے اور مزید کے لیے دوڑ بھاگ میں اس قدر اپنے کو کھپائے رکھتا ہے کہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو بھول جاتا ہے اور اصل فائدہ کی چیزوں و کاموں سے بے پرواو غافل ہو جاتا ہے اور نصیحت و یاد دہانی کے باوجود وہ اسی غفلت میں پڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آجاتا ہے اور سنبھلنے کا موقع ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر وہ ہلاکت کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے جس سے واپسی کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔اس ضمن میں یہ آیت بڑی عبرت انگیز اور سبق آموز ہے:

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ (التکاثر:۱۰۲/۱۔۶)

تم لوگوں کو مال کی حرص اور اس کی طلبِ میں مسابقت نے غفلت میں ڈالے رکھا یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے ۔ ہرگز نہیں! تم بہت جلد جان لوگے۔ہاں، ہرگز نہیں ! تم پھر عنقریب جان لوگے۔ہرگز نہیں! اگر تمہیں حقیقت کا علم ہو جاتا[کہ دوزخ سے ضرور دوچار ہوگے] تو تم اسے [یقین کی آنکھوں سے]ضرور دیکھ لوگے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ جن لوگوں کی مسابقت غلط رخ پر ہے یا روز مرہ زندگی میں جن کی دوسروں سے مقابلہ آرائی کا مقصد صحیح نہیں ہے وہ آخر کار بڑے بھیانک انجام (عذابِ دوزخ) سے دوچار ہوں گے، یعنی ان کی دوڑ بھاگ سودمند ہونے کے بجائے خود ان کے لیے وبالِ جان ثابت ہوگی۔ دراصل یہ نتیجہ ہوگا مال و دولت کی طلب میں دن رات جی جان کھپانے، آخرت سے پوری طرح بے فکری اور اس کی تیاری سے غفلت کا۔ ''تکاثر'' میں، جیسا کہ مفسرین نے وضاحت کی ہے، تین باتیں شامل ہوتی ہیں: کسی چیز کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا، اس باب میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی تگ ودو اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں اس بات پر فخر جتانا کہ اسے دوسرے سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔ اس طرح آیت کے معنی یہ ہوئے کہ مال و اسباب کو کثرت سے جمع کرنے کی حرص و طلب نے لوگوں کو اتنا مشغول کر دیا کہ وہ اپنے خالق و مالک کی یاد سے غافل ہو گئے، اخلاقی حدود سے غافل ہو گئے، عاقبت سے غافل ہو گئے اور حقوق والوں کے حقوق کی ادائیگی سے غافل ہو گئے اور نتیجہ میں اپنی تباہی و بربادی کا سامان مول لے لیے (سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ۶/۲۴۲-۲۴۳)۔ درحقیقت تکاثر یا غلط سمت میں مسابقت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ متاثر شخص کو اپنے دامِ فریب میں اس بری طرح گرفتار کر لیتا ہے کہ اس کی عمر اسی میں بیت جاتی ہے اور اسے اس سوال پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے یا نہیں اور ہے تو اس کے لیے بھی کچھ کرنا ہے کہ نہیں (امین احسن اصلاحی، تدبرِ قرآن، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۹/۵۲۲)۔

یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ اہلِ کتاب کی ضلالتوں اور بری عادتوں کے ذکر میں قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ گناہ کے کاموں، بالخصوص ظلم و زیادتی اور حرام خوری میں خوب تیزی سے بڑھنے والے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کتنی غلط حرکت کر رہے ہیں اور اپنی عاقبت کو خراب کر کے اپنی تباہی و بربادی کو دعوت دے رہے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

تَرَی کَثِیْراً مِّنْھُمْ یُسَارِعُونَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَکْلِھِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُونَ (المائدہ:۵/۶۲)	تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ گناہ کے کام، ظلم و زیادتی اور حرام خوری کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ کتنا برا کام ہے جو یہ کر رہے ہیں۔

گناہ، ظلم اور اکلِ باطل کی راہ میں ان کی بھاگ دوڑ اس قدر ناپسندیدہ اور اللہ کی ناراضگی کی موجب ہے کہ قرآن نے ان کے علما، یعنی علمِ شریعت کے ماہرین کو سخت تنبیہ کی ہے کہ غلط راہ پر چلنے والوں کو وہ کیوں نہیں منع کرتے کہ وہ اس مذموم حرکت سے باز آجائیں اور اپنے کو تباہی سے بچالیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

لَوْلاَ یَنْھٰھُمُ الرَّبَّانِیُّونَ وَالْاَحْبَارُ عَن قَوْلِھِمُ الاِثْمَ وَاَکْلِھِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُونَ (المائدہ:۵/۶۳)	ان کے علما، وفقہا، ان کو گناہ کی بات اور حرام خوری سے منع کیوں نہیں کرتے، کتنی بری ہے یہ حرکت جو وہ یہ کر رہے ہیں۔

قرآن کریم نے مسابقت و مسارعت کے باب میں انسان کی ساری خود ساختہ یا پسندیدہ راہوں کو ختم کرکے صرف ایک راہ اختیار کرنے کی دعوت دی ہے اور وہ ہے آخرت کی راہ۔ اور یہی راہ اسے اصلاً ہمیشہ ہمیش کی کامیابی کے لیے تیار کرنے والی یعنی انہیں عمل صالح پر کاربند رکھنے والی ہے۔ قرآن نے بار بار انسان کو اس پہلو سے متوجہ کیا ہے کہ تعمیر و تزئین کی خاطر اگر کسی چیز کو منتخب کرنا ہے تو وہ آخرت ہے، نہ کہ دنیا کی زندگی۔ اس لیے کہ یہ تو فانی ہے، ایک نہ ایک روز ختم ہو جائے گی، یہاں کا دکھ و سکھ یا راحت و کلفت کچھ زیادہ معنی نہیں رکھتے۔ اصلاً فکر تو اس زندگی کو بنانے و سنوارنے کی کرنی چاہیے جو لازوال یا ابدی ہے۔ یہ آیت اسی پہلو سے انسان کو دعوتِ فکر و عمل دے رہی ہے:

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (الاعلیٰ:۸۷/۱۷)	مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔

اس آیت میں انسان کے اس رویہ پر اظہارِ تعجب ہے کہ اسے کیا ہو گیا ہے کہ وہ فانی کو ابدی زندگی پر ترجیح دے رہا ہے اور ایک دوسرے مقام پر اس کی نفسیات پر اس

انداز میں چوٹ کی گئی ہے کہ وہ کیسا بے صبرا و جلد باز ہے کہ اس دنیا میں جلد ملنے والے فائدہ یا عیش و آرام کو وہ پسند کرتا ہے اور ہمیشہ ہمیش کی زندگی یعنی آخرت میں نصیب ہونے والی بیش بہا نعمتوں اور ابدی وسکون و آرام کو نظر انداز کر دیتا ہے یا اس سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ (القیٰمۃ: ۲۰/۷۵۔۲۱)

ہرگز نہیں! بلکہ تم اس دنیا سے عشق رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو۔

نامور مفسر مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس آیت کی تشریح میں کیا خوب بات لکھی ہے: ''مطلب یہ کہ دنیا نقد ہے اس وجہ سے اس پر فریفتہ ہو اور آخرت نقد نہیں ہے، اس وجہ سے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر رہے ہو'' (تدبر قرآن، تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ۸۹/۹)۔ مذکورہ بالا آیات سے یہی قیمتی سبق ملتا ہے کہ درحقیقت اخروی زندگی ہی اس بات کی مستحق ہے کہ اس کو سنوارنے پر ذہن کو مرتکز کیا جائے اور اس راہ میں عملی جد وجہد کو اور آگے بڑھایا جائے، اس لیے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور اسی کی تعمیر ہر مومن سے مطلوب ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے یہ حقیقت نہایت جامع انداز میں ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: ''اللّٰھمّ لا عیش الّا عیش الآخرۃ'' [اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے] (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ما جاء فی الرقاق وانّ لا عیش الّا عیش الآخرۃ)۔ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ''ریاض الصالحین'' کے اردو مترجم و شارح حافظ صلاح الدین یوسف نے بڑے اہم نکتہ کی طرف متوجہ کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو موقعوں پر یہ الفاظ ادا فرمائے۔ اول غزوۂ خندق کے موقع پر جب صحابۂ کرام نہایت مشکل حالات میں اور تنگ دستی کے عالم میں خندق کھودنے میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں اس وقت صبر کا درس دینا اور یہ کہہ کر ان کا حوصلہ بڑھانا تھا کہ ان کٹھن مراحل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ تو چند روزہ تکلیف کا معاملہ ہے۔ آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے اور وہاں کا آرام لازوال ہے۔ دوسرے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس وقت آپ ﷺ نے یہ بات دہرائی جب اہلِ اسلام کا جمّ غفیر آپ کے سامنے تھا اور انہیں

یہ تنبیہ کرنی مقصود تھی کہ کثرت وطاقت دیکھ کر غرور اور بہت زیادہ خوشی میں نہ مبتلا ہو جانا کہ یہ سب کچھ عارضی ہے، یہ شوکت وحشمت آخر کار ایک دن ختم ہو جائے گی۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، اس کی اصلاح کی خاطر بھر پور کوشش اور مسلسل بھاگ دوڑ کی ضرورت ہے (ریاض الصالحین رترجمہ، فوائد، تحقیق وتخریج از: صلاح الدین یوسف، دارالسلام، ریاض، ۱۹۹۷ء، ۱/۴۱۹)۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس دائمی زندگی کی تعمیر اور اصلاحِ احوال کی راہ میں بنیادی کام یہ ہے کہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کیا جائے اور خوب نیکیاں کمائی جائیں اور عملِ صالح کا ذخیرہ جمع کیا جائے۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بہت ہی صاف لفظوں میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اخروی زندگی میں کام آنے والے صرف نیک اعمال ہیں جنہیں اس نے ''الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے کہ نیک اعمال کا اجر وثواب ہی اللہ کے یہاں محفوظ رہ کر باقی رہنے والا اور اخروی زندگی کی بہتری وکامیابی کا ذریعہ بننے والا ہے اور باقی ساری چیزیں فانی ہیں اور دنیا ہی میں انسان کا ساتھ چھوڑ دینے والی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ''وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا'' [اور تیرے رب کے نزدیک باقی رہنے والے اعمال صالحہ اجر کے اعتبار سے بہتر اور امید کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں] (الکھف: ۱۸/۴۶)۔ اسی طرح سورہ مریم ۷۶ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا'' [اور تیرے رب کے نزدیک باقی رہنے والے اعمال صالحہ اجر کے اعتبار سے بہتر اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں]۔ ان سب سے مقصود یہ ذہن نشیں کرانا ہے کہ حیاتِ جاوداں کی کامیابی وخوشگواری انہی باقیات صالحات پر منحصر ہے اور آخرت میں انہی کی قدر وقیمت ہوگی۔ لہٰذا انسان کو جو کچھ توانائی، صلاحیت اور وسائل عطا ہوئے ہیں انہیں باقیات صالحات کا خزانہ بڑھانے کے لیے صرف کرنا چاہیے اور اس کام میں تیزی دکھانا چاہیے۔

قرآن کریم میں نیکی کی راہ میں سرگرم رہنے اور اس راہ میں ایک دوسرے پر

سبقت لے جانے پر اس پہلو سے بھی ابھارا گیا ہے کہ یہ ایک ایسی تجارت ہے جس میں خسارہ کا کوئی سوال ہی نہیں، بلکہ اس میں سراسر نفع ہے۔ سورہ فاطر (آیت ۲۹) میں ان مومنین کے ذکر میں جو قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، نماز کا اہتمام کرتے ہیں اور اللہ کے عطا کردہ مال میں سے اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے ہیں یہ ارشادِ الٰہی ہے کہ ''وہ ایسی تجارت میں اپنے آپ کو لگائے ہوئے ہیں جو بڑی نفع بخش ہے اور جس میں نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے''۔ ہر نیکی کے اجر میں دس گنا کا اضافہ یہ تو عام ضابطہ ہے۔ اس کے علاوہ اللہ رب العزت ایمان اور اعمالِ صالحہ کے اجر میں جتنا چاہے اضافہ کردے، اس کے فضل و کرم کی کوئی انتہا نہیں، اس کے انعامات کے خزانہ میں کوئی کمی نہیں۔ وہ قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيْدُهُم مِّن فَضْلِهِ (النساء: ۱۷۳/۴)	پس جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو وہ ان کو پورا پورا اجر دے گا اور اپنے فضل سے ان کو مزید بخشے گا۔
لِّلَّذِيْنَ أَحْسَنُواْ الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ (یونس: ۲۶/۱۰)	جن لوگوں نے اچھے کام کیے ان کے لیے اچھا بدلہ ہے اور مزید بھی۔

دوسرے قرآن کریم میں اس طور پر بھی نیکی کمانے کی ترغیب دی گئی ہے کہ اس تجارت میں مصروف رہنے کا سب سے قیمتی و نفع بخش پہلو یہ ہے کہ یہ حقیقی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے جو ہر مومن کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (الحج: ۷۷/۲۲)	اے ایمان والو رکوع و سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو اور نیکی کے کام کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ نوٹ بہت ہی جامع ہے: ''اللہ کی بندگی و نیاز میں سرگرم رہو، تمھارے سارے کام خیر و صلاح پر مبنی ہوں۔ اگر حسنِ عمل کی یہ روح تم میں بس گئی تو تمھارے لیے فلاح ہی فلاح ہے'' (ترجمان القرآن، ساہتیہ

اکادیمی، نئی دلّی، ۱۹۷۰ء، ۸۵۰/۴)۔

تیسرے قرآن اس پہلو سے بھی انسان کو نیک عمل پر ابھارتا ہے کہ وہ یہ یقین رکھے کہ وہ جو کچھ نیک عمل کرتا ہے وہ سب اللہ کے علم میں ہے اور روزِ حساب اس کے عمل کا ریکارڈ اس کے سامنے آجائے گا۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ کہ انسان انجام اور اجر کے اعتبار سے اس عمل کو بڑا اور بہتر پائے گا جو خیر یا نیکی کے زمرے میں ہوگا۔ ان آیات سے یہی حقائق واضح ہوتے ہیں:

وَمَا تَفْعَلُواْ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّهَ بِهِ عَلِيمٌ (البقرہ:۲۱۵/۲)
جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَراً (آل عمران:۳۰/۳)
[اور یاد کرو اس دن کو] جس دن ہر انسان اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گا۔

وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْراً وَأَعْظَمَ أَجْراً (المزمل:۲۰/۷۳)
اور جو کچھ نیکی بھی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے تو اس کو اللہ کے یہاں موجود پاؤ گے۔ وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اوپر محولہ آیات میں بار بار اہلِ ایمان کو اعمالِ صالحہ کی انجام دہی پر ابھارا گیا ہے، باقیاتِ صالحات کا ذخیرہ جمع کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، نیکیاں (حسنات) کمانے پر زور دیا گیا ہے اور اس راہ میں مسابقت یا ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ان آیات میں اعمالِ صالحہ/باقیاتِ صالحات/حسنات سے کیا مراد ہے؟۔ حقیقت یہ کہ قرآن کی نظر میں اعمالِ صالحہ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ انہیں موٹے طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: عبادات، اخلاقیات اور معاملات۔ قرآن وحدیث کی رو سے عمل صالح کا تعلق تینوں سے ہے، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اسے پہلے حصہ (حقوق اللہ کی ادائیگی) میں محدود سمجھا جاتا ہے اور باقی دو پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ بدیہی طور پر اخلاقیات ومعاملات کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ قرآن نے حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی

ادائیگی پر بھی بہت زور دیا ہے۔ انسانوں کو خطاب کر کے نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے حقوق یاد دلائے گئے ہیں، بلکہ یہ واضح بھی کیا گیا ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی نیکیاں کمانے اور ان کا خزانہ بڑھانے کا بہت بڑا ذریعہ اور بالآخر اخروی نجات کا وسیلہ ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر یہ اعمال (جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے) اعمالِ صالحہ کے زمرہ میں نہیں آتے تو ایمان والوں کو ان کی انجام دہی پر فوز وفلاح کی خوش خبری کیوں دی جاتی۔ مذکورہ بالا حقائق ان آیات (المومنون: ۲۳/۱۔۱۱، الفرقان: ۲۵/۶۴۔۷۶، الاحزاب: ۳۳/۳۵، المعارج: ۷۰/۲۲-۳۵) سے واضح طور پر سامنے آتے ہیں جن میں حسن اخلاق، خوش گفتاری و نرم روی، سچائی و امانت داری، ایفائے وعدہ وقول وقرار کی پابندی، تواضع و انکساری، فخر وغرور سے دوری، اعتدال و میانہ روی، حقوق انسانی کی پاس داری، ظلم و زیادتی سے اجتناب، لغو باتوں سے پرہیز، غریبوں ومحتاجوں کی اعانت، یتامیٰ کی خبر گیری و کفالت کو مومنین کے امتیازی اوصاف یا ایمان کے ثمرات میں شامل کر کے ان اوصاف کے حاملین کو حقیقی کامیابی و جنت کی بشارت دی گئی ہے اور رضائے الٰہی نصیب ہونے کا مژدہٗ جانفزا سنایا گیا ہے۔ ان آیات سے نہ صرف اچھائیوں و بھلائیوں کو کر گزرنے اور انہیں فروغ دینے کی اہمیت وفضیلت واضح ہوتی ہے، بلکہ اس کام میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ خاص بات یہ کہ یہ قرآنی ہدایات وتعلیمات حقوق اللہ وحقوق العباد دونوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ واقعہ یہ کہ قرآن کریم میں ''خیرات'' کے اکتساب میں آگے بڑھنے یا نیکیاں کمانے میں تیزی دکھانے کا جو حکم دیا گیا ہے (فاستبقوا الخیرٰت / سارعوا الیٰ مغفرة من ربّكم و جنّة) اور اہلِ ایمان کے اوصاف میں جو یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ نیکیوں کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھنے والے اور اسے پا جانے والے ہیں (یسارعون فی الخیرٰت و هم لها سابقون) اور انہیں جو نیکی کے کام کرنے کی خاص تاکید کی گئی ہے (وافعلوا الخیر) ان سے متعلق یہ بات سوچنے وسمجھنے کی ہے کہ کیا خیر کا عمل انجام دینے یا خیرات کی راہ میں مسارعت سے مراد صرف عبادات کی ادائیگی ہے یا ان میں دیگر امور کی انجام دہی بھی شامل ہے۔

حقیقت یہ کہ متعلقہ آیات پر سیاق وسباق کی روشنی میں غور وفکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''الخیر/الخیرات'' سے مراد ہر وہ عمل ہے جو اللہ رب العزت کو راضی کرنے والا ہے، ہر وہ کام ہے جس سے اللہ کے یا اس کے بندوں کے کسی حق کی ادائیگی ہوتی ہے اور اس کے مفہوم میں ہر وہ جدوجہد اور بھاگ دوڑ شامل ہے جس سے دوسروں کا بھلا ہو یا لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ یہ حقیقت اس وقت اور کھل کر سامنے آجائے گی جب ان آیات کو سمجھ کر پڑھا جائے، جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے کون سے اعمال اللہ کو پسند آتے ہیں (البقرۃ:۲/ ۲۲۲،۱۹۵: آل عمران:۳/ ۷۶، ۱۳۴، ۱۴۶، ۱۵۹؛ المائدہ:۵/۴۲؛التوبۃ:۹/ ۱۰۸، الصّف :۶۱/۴) اور کون ناپسند (البقرۃ:۲/ ۱۹۰، ۲۷۶؛ آل عمران:۳/ ۳۲، ۵۷؛ النساء: ۴/ ۳۶، ۱۰۷؛ المائدۃ:۵/۶۴؛ الانعام:۶/ ۱۴۱؛ الانفال: ۸/۵۸؛ النحل:۱۶/ ۲۳؛ الحج: ۲۲/ ۳۸؛ القصص:۲۸/ ۷۶) یا کن کاموں کی انجام دہی اللہ کی رضا نصیب کرتی ہے اور کن کا ارتکاب اس کی ناراضگی کا موجب بن کر ہلاکت وتباہی ساتھ لاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ جن آیات میں اکتسابِ خیر یا مسابقت الی الخیر کی تعلیم وترغیب دی گئی ہے ان پر تدبر وتفکر سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ چھوٹی بڑی، معمولی یا اہم جس قسم کی بھی نیکی کے حصول کا موقع ملے آگے بڑھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ نیکی نیکی ہے خواہ چھوٹی ہو یا بڑی یا کارِ خیر باعثِ اجر وثواب ہے چاہے معمولی ہو یا اہم۔ سورہ الزلزال کی مشہور آیات (فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ) کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس جانب متوجہ کیا ہے کہ ''یہ آیت انسان کو ایک بہت اہم حقیقت پر متنبہ کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اپنا وزن اپنی ایک قیمت رکھتی ہے اور یہی حال بدی کا بھی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے، یونہی نظر انداز کردینے والی چیز نہیں ہے'' (تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، ۶/ ۴۲۴)۔

واقعہ یہ کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں بھی ذخیرۂ حسنات میں اضافہ کرتی رہتی ہیں اور ان کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب روز جزا انسان کو ابدی زندگی کی بہتری و

خوشگواری کے لیے اسی ذخیرہ کے بھرے ہونے کی اشد ضرورت ہوگی۔ قرآن کریم میں بالکل عام انداز میں نیکیاں کمانے اور خیر کے کام کرنے پر بار بار ابھارا گیا ہے۔ حقیقت یہ کہ ان سے مقصود ہر نیک کام ہے خواہ اس کا تعلق زندگی کے کسی شعبہ سے ہے اور چاہے وہ کسی بھی نوعیت (چھوٹا یا بڑا) کا ہو۔ یہ آیت اوپر گزر چکی ہے: **يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَـنُـوا ارْكَعُـوا وَاسْـجُـدُوا وَاعْـبُـدُوا رَبَّـكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ** /الحج: ۲۲/۷۷ [اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور خیر کے کام کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ]۔ اسی طرح نیکیوں کی راہ میں سبقت کرنے کی ہدایت بھی دی گئی ہے (فاستبقوا الخیرٰت)۔ اس سے دو اہم باتیں معلوم ہوئیں: اول یہ کہ عبادت کے علاوہ بھلائی کے اور کام بھی ہیں جن کی انجام دہی اہلِ ایمان سے مطلوب ہے، دوسرے بغیر کسی تفریق کے چھوٹا بڑا جو بھی بھلائی کا کام ہو اسے بلا تاخیر کر ڈالنا چاہیے۔ اس ضمن میں ''نورِ ہدایت'' کے مصنفِ گرامی کا یہ تبصرہ بہت معنی خیز ہے: نیکی کوئی بھی ہو وہ کرنے کے لیے ہے اور بدی کوئی بھی ہو وہ بچنے کے لیے ہے'' (نورِ ہدایت- افاداتِ حافظ سید عبدالکبیر عمری، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، جامعہ دارالسلام، عمر آباد، ۲۰۱۴، ص ۳۰۹)۔ حضرت ابو ذرؓ سے مروی یہ حدیث بڑی اہمیت و معنویت کی حامل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: '' **لا تحقرنّ من المعروف شيئاً ولو ان تلقىٰ اخاك بوجه طلق**'' [نیکی کے کسی کام کو حقیر نہ سمجھو گرچہ اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا ہی کیوں نہ ہو] (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب استحباب طلاقۃ الوجہ عند اللقاء)۔ مزید براں یہاں یہ وضاحت بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگی کہ نیکی کمانے کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ دوسروں کو تکلیف سے بچایا جائے اور اپنے شر سے لوگوں کو محفوظ رکھا جائے، جیسا کی حدیث سے ثابت ہے کہ یہ بھی صدقہ ہے یعنی موجبِ اجر و ثواب ہے (صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب علیٰ کلّ مسلم صدقۃ)۔ دوسروں کو تکلیف سے بچانے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، ان میں راستہ سے تکلیف دہ چیز (مثلاً کانٹا وغیرہ) کا ہٹانا بھی شامل ہے، جسے ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا گیا ہے (صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب امور الایمان)۔ ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ

سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **بینما رجل یمشی بطریق وجد غصن شوک علی الطریق فاخرہ فشکر اللہ لہ فغفر لہ** [ایک دفعہ ایک شخص راستہ میں چلا جا رہا تھا کہ اس نے ایک کانٹے دار شاخ دیکھی۔ اس نے راستہ سے اسے ہٹا دیا (کہ کسی کو اس سے تکلیف نہ پہنچے)۔ اللہ رب العزت نے اس کے عمل کی قدر فرمائی اور اسے بخش دیا] (صحیح مسلم، کتاب البر، باب فضل ازالۃ الاذیٰ عن الطریق)۔ اسی طرح حضرت ابوذرؓ سے ایک دوسری روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ پر میری امت کے اچھے و برے عمل پیش کیے گئے، پس میں نے اس کے اچھے اعمال میں راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا بھی پایا (ریاض الصالحین، محولہ بالا، ۱/۱۴۷)۔ ان ارشادات نبوی ﷺ سے یہ قیمتی سبق ملتا ہے کہ کسی نیکی کو حقیر اور بھلائی کے کسی کام کو معمولی و ہلکا نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ جب اور جہاں بھی نیکی کرنے کا کوئی موقع میسر آئے اسے کرگزرنا چاہیے، ممکن ہے وہی نیکی جسے ہم معمولی سمجھ رہے ہیں، اللہ کو پسند آجائے اور وہی ہماری بخشش کا سامان بن جائے۔

آخر میں ایک اور امر کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اوپر کے مباحث سے کسی کے ذہن میں یہ خیال نہیں پیدا ہونا چاہئے کہ مال و دولت کمانا، زندگی بسر کرنے کے لیے ساز و سامان حاصل کرنا یا دنیا میں آرام و راحت کے لیے کوشش کرنا قرآن کی نظر میں مذموم ہے یا ایسا کرنا آخرت کے لیے تیاری کے منافی ہے۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ اسلام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں ہے۔ اصل چیز نیت کی درستی اور طرز عمل کی صحت ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم میں مال کو فتنہ کہا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (الانفال: ۸/۲۸)	اور جان لو! یقیناً تمھارے مال و اولاد فتنہ ہیں اور یہ کہ بے شک [تمھارے نیک اعمال کا] اللہ کے یہاں بہت بڑا اجر ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشادِ گرامی سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے: **عن کعب ابن عیاضؓ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول انّ لکلّ امۃ فتنۃ وفتنۃ امّتی المال**

[حضرت کعبؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کے لیے فتنہ مال ہے] (جامع ترمذی، ابواب الزہد، باب ماجاء انّ فتنۃ ھذہ الامۃ فی المال)۔ فتنہ کے معنی آزمائش کے ہوتے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مال کمانے، جمع کرنے، خرچ کرنے اور مالی معاملات برتنے میں قدم قدم پر آزمائش ہے۔ مالی معاملات میں لغزشیں کھانے کے بڑے خدشات ہوتے ہیں۔ مال کی محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لیے اس سے متعلق معاملات میں یہ خدشات اور بڑھ جاتے ہیں اور اس میں آزمائش شدید سے شدید تر ہوجاتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی دلچسپ حقیقت ہے کہ قرآن میں مال کو ''خیر'' بھی کہا گیا ہے (البقرۃ: ۲/۲۱۵، ۲۷۲، العدیات: ۱۰۰/۸) اور بلاشبہ مال نعمتِ خداوندی ہے۔ مال کب خیر بنتا ہے اور کب یہ نعمت ثابت ہوتا ہے۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ جب اسے احکامِ الٰہی کے مطابق کمایا جائے، رکھا جائے اور خرچ کیا جائے۔ یعنی جب اکتسابِ مال میں قرآنی ہدایات کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے اور اللہ تعالیٰ نے اس میں دوسروں کے جو حقوق مقرر کیے ہیں انہیں پوری دیانت داری سے ادا کیا جائے تو مال فتنہ کے بجائے موجبِ خیر و برکت بن جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص مال کی محبت میں غرق ہوکر اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کو بھول جائے تو گویا وہ آزمائش میں ناکام ہوگیا۔ اس صورت میں وہی مال جو نعمتِ الٰہی ہے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ مال کو اگر صحیح طریقہ سے خرچ کیا جائے، اس سے حاجت مندوں کی حاجت روائی کی جائے اور غرباء و مساکین کو مدد بہم پہنچائی جائے تو ایسا کرنے والا بڑے اجر وثواب کا مستحق بن جاتا ہے اور اس کے باقیات صالحات کا ذخیرہ بڑھ جاتا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے: ظفر الاسلام اصلاحی، قرآنی مطالعات، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء [باب چہارم: مالی معاملات میں قرآن کے مطالبات]، ص ۸۰۔۹۴)۔ مزید براں قرآن کریم میں مال کو ''قیام'' (بقا کا ذریعہ یا سہارا) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے (النساء: ۴/۵)۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ نہ صرف انفرادی کام میں آتا ہے، بلکہ سماجی، اجتماعی و ملی مفاد کے بھی بہت سے مفید و ضروری کام اس کے توسط سے

ہر دور میں انجام پاتے رہے ہیں۔قرآن کریم میں مختلف مقامات پر دین کی راہ میں جان و مال کی قربانی کی دعوت اس طور پر دی گئی ہے کہ یہ ایک ایسی تجارت ہے جو سراسر نفع بخش ہے اور آخرت میں کامیابی کی راہیں ہموار کرنے والی ہے، اس لیے جان و مال کی پونجی اللہ کی رضا کی راہ میں لگ جائے اس سے بڑھ کر اس کا بہترین سودا اور کیا ہوسکتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنجِیْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِیْمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِیْ سَبِیْلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (الصف:۶۱/۱۰۔۱۱)	اے اہلِ ایمان! کیا میں تمھیں ایسی تجارت نہ بتاؤں جو تمھیں دردناک عذاب سے بچا لے، وہ یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرو یہی تمھارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھ سے کام لو۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محمد یوسف اصلاحی نے اس کے قیمتی نکتہ کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے:

> ''جان و مال یہی آدمی کی کل پونجی ہے اور خدا نے اسے یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو اس کے ذریعہ سے ایمان کمائے اور چاہے تو کفر کمائے۔ اس معاملہ کو قرآن نے تجارت سے تعبیر کیا ہے۔ کامیاب تجارت یہ ہے کہ آدمی خدا اور رسول پر ایمان لاکر جان و مال کی یہ پونجی اس کی رضا کی راہ میں لگادے اور آخرت کے دردناک عذاب سے چھٹکارا پائے۔ یہ ایک ایسی کامیاب تجارت ہے، جس کا نفع لازوال ہے'' (قرآنی تعلیمات، محولہ بالا، ص۴۶)۔

قرآن کی دیگر آیات میں بھی یہ واضح کیا گیا ہے کہ مال (جسے فتنہ کہا گیا ہے) کو کیسے ذاتی و اجتماعی طور پر نفع بخش اور موجبِ خیر و فلاح بنایا جاسکتا ہے۔ عہدِ نبوی ﷺ میں صحابہ کرامؓ نے مال کو باعثِ خیر بنانے اور اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے مال کو قربان کرنے

کی جو نادر مثالیں چھوڑی ہیں وہ نہ صرف اسلامی تاریخ کا انتہائی روشن باب ہیں بلکہ وہ آج بھی ہمارے لیے لائقِ اتباع ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ما لاحد عندنا يد الا وقد كافيناه ما خلا ابو بكر فانّ له عندنا يداً يكافئه الله بها يوم القيامة وما نفعني مال احد قطّ ما نفعني مال ابى بكر** (جس کسی نے ہم پر احسان کیا ہم نے اس کا عوض دے دیا سوائے ابو بکر کے۔ بے شک ان کا ہم پر اس قدر احسان ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کی جزا دے گا۔ کسی بھی شخص کے مال نے مجھے اتنا نفع نہیں پہنچایا جتنا کہ ابو بکر کے مال نے پہنچایا) (جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب ابی بکرؓ؛ اوراقِ سیرت، ص ۱۱۴)۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے نبی کریم ﷺ کو جو کچھ مالی تعاون دیا وہ امت کے افراد پر صرف ہوا یا ان کے اجتماعی مفاد کے کام کے کاموں پر۔ مختصر یہ کہ اپنی، گھر والوں کی یا لوگوں کی جائز ضروریات کی تکمیل کے لیے دوڑ دھوپ کرنا، مال کمانا اور اسے اپنے یا مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے کاموں میں خرچ کرنا اسلام میں نہ صرف مطلوب ہے، بلکہ عین دین کا کام ہے اور باعثِ خیر ہے، جیسا کہ ایک حدیث سے اس کی مزید توثیق ہوتی ہے: نبی کریم ﷺ ایک روز کچھ اصحاب کرامؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ انہوں نے ایک قوی الجثہ اور طاقت ور نوجوان کو دیکھا جو (اپنے کام کے لیے) خوب دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ انہوں نے اسے دیکھ کر کہا کاش کہ اس کی نوجوانی و طاقت اللہ کی راہ میں صرف ہوتی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: یہ نہ کہو، اس لیے کہ یہ شخص اگر اپنے لیے کام کرتا ہے اس خیال سے کہ اسے (دوسروں کے سامنے) سوال کرنے سے باز رکھے اور لوگوں سے بے نیاز کر دے تو وہ اللہ کی راہ میں ہے اور اگر اپنے ضعیف والدین اور کمزور بچوں کے لیے کرتا ہے تا کہ وہ محتاج نہ ہوں، تب بھی وہ اللہ کی راہ میں مصروف ہے، لیکن اگر اس لیے (دوڑ دھوپ) کرتا ہے کہ مال کی کثرت میں دوسروں سے مقابلہ اور ان پر فخر کرے تو اس صورت میں وہ شیطان کی راہ میں مصروف ہے (ابو حامد محمد الغزالی، احیاء علوم الدین، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۱ء، ۲/۵۹)۔

مختصر یہ کہ مومن کے لیے تگ و دو، بھاگ دوڑ اور مسابقت کا اصل میدان نیکی کمانا، نیکی کا خزانہ جمع کرنا اور اعمالِ صالحہ کا ذخیرہ بڑھانا ہے، اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ یہی ذخیرہ آخرت میں کام آنے والا اور ہمیشہ ہمیش کی زندگی کو کامیاب و خوش گوار بنانے والا ہے۔ جو کچھ جسمانی طاقت، ذہنی صلاحیت، علمی لیاقت اور مالی وسعت اور عمل کی مہلت ملی ہوئی ہے وہ سب بلا شبہ اللہ رب العزت کا عطیہ ہے، اس پر شکر گزاری کا تقاضا یہی ہے کہ انھیں ایسے کاموں میں صرف کیا جائے جو اللہ کو راضی کرنے والے یا اس کی نگاہ میں محبوب بنانے والے ہیں۔ درحقیقت دانش مندی بھی یہی کہتی ہے کہ قوت، صلاحیت اور وسائل کو اس طور پر استعمال کیا جائے کہ اس ذخیرہ میں ترقی ہو جس کی قدر و قیمت آخرت میں ہوگی جب کہ باقی سارا مال و متاع دنیا سے رخصت ہوتے ہی ساتھ چھوڑ دے گا اور کچھ کام نہ آئے گا۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ نیکی انسان کے لیے سب سے بڑی کمائی اور سب سے قیمتی پونجی ہے۔ یہی دنیوی زندگی کو بامقصد بناتی ہے اور آخرت کے لیے بہترین توشہ فراہم کرتی ہے۔ اوپر کی تفصیلات سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ عمل صالح و نیکی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ فرائض سے لے کر مستحبات تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں نیکی کمانے اور اس کا ذخیرہ جمع کرنے کے مواقع میسر ہیں، بشرطیکہ اس کی طلب ہو اور اخروی زندگی کی فکر غالب ہو۔ اکتساب خیر یا مسارعت الی الخیر سے متعلق آیات و احادیث سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ نیکی نیکی ہے، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ درحقیقت چھوٹی چھوٹی نیکیاں ذخیرۂ حسنات کو بڑھاتی رہتی ہیں، اس لیے اس ذخیرہ کو بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش جاری رکھی چاہیے۔ اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب روز جزا انسان کو ابدی زندگی کی بہتری و خوشگواری کے لیے اسی میزانِ عمل کے بھاری ہونے کی اشد ضرورت ہوگی۔ اللہ ہمیں نیکیوں کا خوگر بنا دے اور ہمارے دلوں میں نیک عمل کی محبت اور قدر و قیمت نقش کر دے۔ ربّنا وفقنا لما تحبّ وترضیٰ.

-آمین ثم آمین-